اِسلامی نظامِ معیشت کے لیے غور طلب مسائل

[موجودہ دَور میں طریقِ معیشت کے پیچیدہ اور غیر عادلانہ ہو جانے کی وجہ سے دَورِ حاضر کے انسان کے لیے معاشی مفاد سب سے اہم مفاد بن گیا ہے، خاص طور پر مسلمانوں کے لیے جن کی زندگی میں تاریخی انقلابات نے ایسے تقاضے پیدا کر دیئے ہیں کہ ان کے ہاتھ سے معاشی انقلاب کی قیادت چھن جانے کی بدولت بادلِ نخواستہ اسلامی طرزِ فکر و عمل سے انحراف کا میلان پیدا ہوا ہے۔ اس صورتِ حال نے اسلام اور مسلمانوں سے دلسوزی رکھنے والوں کو اسلامی نقطۂ نظر سے معاشی مسائل کے حل کی طرف شدت سے متوجہ کیا ہے اور جگہ جگہ ان مسائل پر غور و فکر کیا جا رہا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے معیشت کے مسئلہ پر ایک بے حد فکر انگیز سوالنامہ میجر ایم۔ اے حمید صاحب کی طرف سے اصحابِ فکر و نظر کی خدمت میں روانہ کیا گیا ہے اور ان سے خواہش کی گئی ہے کہ وہ ان مسائل پر غور و خوض کر کے انہیں اپنے نتائجِ فکر سے مطلع کریں۔

میجر صاحب موصوف نے جن مسائل کی نشاندہی کی ہے وہ آج ہماری قومی زندگی کے لیے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ہم یہ سوالنامہ اپنے جریدہ میں اس مقصد کے پیشِ نظر شائع کر رہے ہیں کہ قارئین جریدہ میں سے جن حضرات کو ان مسائل سے دلچسپی ہو وہ ان مسائل کے حل کے ضمن میں اگر اظہارِ خیال کرنا چاہیں تو سوالات کے جوابات میجر صاحب موصوف کو بھیجیں اور جن مسائل پر تفصیلی بحث ضروری ہو تو اس کے لیے اس جریدہ کے صفحات بھی حاضر ہیں۔ ایڈیٹر]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی و محترمی جناب

السّلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ سے اس امر میں رہنمائی مطلوب ہے کہ جو مشکلات ماہرینِ معاشیات و مالیات زکوٰۃ کی

ترویج میں حائل سمجھتے ہیں ان پر غور کر کے ان کے مناسب حل سے آگاہ فرمائیں تاکہ نظام زکوٰۃ کے رائج کرنے میں حائل دقتوں کو عبور کیا جا سکے۔ بعض حلقے جو مالیاتی پہلوؤں کے علاوہ اس مسئلے کے دینی متعلقات سے بھی آگاہی رکھتے ہیں، محسوس کر رہے ہیں کہ اموال و شرح زکوٰۃ میں اجتہادی تبدیلیوں کے بغیر فریضۂ زکوٰۃ کی تنظیم مشکل ہوگی۔ اس سلسلے میں بعض اسناد بھی پیش کی جا رہی ہیں جن کی نقلی اور عقلی صحت یا عدمِ صحت کے متعلق آپ بہتر رائے قائم کر سکتے ہیں۔ اس مسئلہ کی جزئیات کو بہتر طریقے سے احاطہ کرنے کے لیے یہ سوالنامہ آپ کی خدمت میں بھیجا جا رہا ہے۔ جواب اسی ترتیب اور نمبر شمار سے دے کر ممنون فرمائیں جو سوالنامے میں دیئے گئے ہیں۔ جو اہم نکات اس سوالنامہ میں شامل ہونے سے رہ گئے ہوں انہیں اضافی نکات کے عنوان کے تحت جوابات کے آخر میں تحریر فرمائیں تاکہ اس مسئلہ میں آراء کو مرتب کرنے کے بعد اگر کچھ سوال حل طلب باقی رہ جائیں تو انہیں دینی علوم اور مالیاتی مسائل کے ماہرین اور دیگر اہلِ دانش کے مشترکہ اجلاس میں پیش کر کے حل کرنے کی سعی کی جا سکے۔ امید ہے کہ آپ اس مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اپنی اوّلین فرصت میں اپنا مدلّل جواب بھجوا کر عنداللہ ماجور ہوں گے۔ آپ کا جو بھی جواب ہو اس کے لیے اسناد ضرور تحریر فرمائیں۔

آپ کا مخلص

ایم۔ اے حمید خاں (میجر ریٹائرڈ)

معرفت

پوسٹ ماسٹر دومیل، مظفر آباد (آزاد کشمیر)

سوالنامہ

جزوِ اوّل

(۱) کلامِ پاک میں شرحِ زکوٰۃ اور اموالِ زکوٰۃ کہیں بیان نہیں کیے گئے۔ جو آیات اِنفاق فی سبیل اللہ کی مقدار کی طرف اشارہ کرتی ہیں وہ جس قربانی کا تقاضا کرتی معلوم ہوتی ہیں کیا وہ مروّجہ شرحِ زکوٰۃ سے خاصی زیادہ نظر نہیں آتی؟ مثلاً

(الف) آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں، کہیں جو ضرورت سے فاضل ہو۔ (۲ : ۲۱۹)

(ب) اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی ہے۔ پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جن کو برتری دی گئی ہے وہ اپنی روزی کو اپنے زیر دستوں پر لوٹا دیں کہ اس میں وہ سب برابر ہو جائیں۔ پھر کیا یہ اللہ کی نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہو رہے۔ (۱۶: ۷۲)

(ج) بے شک اللہ نے ایمان والوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں کہ ان کے بدلے میں ان کے لیے جنت ہے۔ (۹: ۱۱۱)

(۲) اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا یہ مناسب نہیں ہو گا کہ شرحِ زکوٰۃ کو اس کی مروجہ سطح سے اٹھا کر اس سطح پر لے جایا جائے جو ان آیات کے مفہوم کے قریب تر ہو۔

(۳) اگر مقاصدِ زکوٰۃ (وہ آٹھ مصارف جو قرآن نے بیان کیے ہیں) آج کے حالات میں شرح زکوٰۃ پورا کرنے سے قاصر ہوں تو ہم کس چیز کو فوقیت دیں گے۔ مقاصد زکوٰۃ کو کہ کلام اللہ نے معیّن کیے ہیں یا شرح زکوٰۃ کو جو انفاق کا تقاضا کرنے والی آیات مندرجہ بالا سے کم تر سطح پر نظر آتی ہے؟

(۴) کلامِ پاک نے اموالِ فے کی تقسیم کا ذکر کرتے ہوئے ایک مالیاتی اصول متعین کیا ہے "تاکہ دولت تمہارے باثروت طبقہ میں ہی گردش نہ کرے (۵۹: ۷)۔ اموالِ فے تو ہمارے پاس موجود ہی نہیں کیا اس وجہ سے اس مالیاتی اصول کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ نظام زکوٰۃ کو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بنا یا جائے؟

(۵) انفاق فی سبیل اللہ کا حکم اتنی بار مختلف اندازِ بیان اختیار کر کے اللہ پاک دیتے ہیں کہ یہ نیکی اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب نیکیوں کی اوّلیت کی حامل معلوم ہوتی ہے مثلاً "تم کبھی نیکی کو نہیں پا سکو گے۔ اگر تم اس چیز میں سے صرف نہ کرو جس سے تم محبت کرتے ہو" (۳: ۹۲) بے شک یہ انفرادی انفاق کی ہدایت ہے لیکن اگر باثروت طبقہ اس حکم کو پسِ پُشت ڈال رہا ہو اور ملک میں اس وجہ سے بے اطمینانی اور عدمِ استحکام پیدا ہو رہا ہو تو کیا حکومت کے لیے ایسے اقدامات کرنا ضروری نہیں ہو جاتا کہ وہ محاصلِ زکوٰۃ کو اس سطح پر لے جائے جس سے باثروت طبقہ اپنی فاضل دولت حکومت کے توسّط سے مفلس و نادار کی اعانت کے لیے دینے پر مجبور ہو جائے اور اس طرح سے بے اطمینانی اور عدمِ استحکام کی فضا کا خاتمہ کر دیا جائے؟

(۶) اللہ پاک کا حکم ہے کہ دولت کا اکتناز نہ کیا جائے "جو لوگ چاندی اور سونا جمع کرتے ہیں اور انہیں

اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی بشارت دیں" (۹ : ۳۴)۔ زکوٰۃ کا نظام رائج نہ ہونے کی وجہ سے اور انفاق پر باثروت طبقہ کے مائل نہ ہونے کے باعث دولت چند ہاتھوں میں مرکوز ہو رہی ہے اور بے اطمینانی بڑھ رہی ہے۔ کیا زکوٰۃ کو کسی ایسی شرح پر اٹھا لے جانے کا وقت نہیں آگیا کہ جس سے ہمارا باثروت طبقہ "دردناک عذاب" سے بچ جائے اور ہماری آبادی کی اکثریت جن مجبوریوں میں مبتلا ہے، ان کا کوئی مداوا ہو سکے؟

(۷) یہ خیال کہ شرح زکوٰۃ نہ بدلی جائے بلکہ ٹیکسوں کے ذریعے فاضل دولت حاصل کر لی جائے، اس بنیادی وجہ سے بعض لوگوں کو محل نظر ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے آٹھ مصارف قرآن مجید نے معین کیے ہیں۔ ان آٹھ میں سے پہلا محتاج، مسکین کی مدد ہے۔ اگر زکوٰۃ کی مروجہ شرح پر متوقع آمدنی اس ایک مصرف کے لیے بھی کفی نہ ہو اور اسے بھی دیگر ٹیکسوں سے پورا کرنا ہو تو پھر زکوٰۃ کی فرضیت کا مقصد فوت تو نہیں ہو جاتا؟ اگر غربت و افلاس کا علاج بھی زکوٰۃ کے پاس نہیں ہے تو پھر زکوٰۃ کے پاس کیا ہے؟

(۸) اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے ہمیں اس خیال کی صحت یا عدمِ صحت طے کر لینی چاہیے کہ زکوٰۃ اور صدقہ میں جو فرق ہمارے رواجی فکر میں موجود ہے اس کی تائید نہ قرآنِ پاک کرتا معلوم ہوتا ہے اور نہ احادیثِ رسولؐ۔ وہ آیتِ کریمہ جس کے نزول سے مفسرینِ کرام زکوٰۃ کی فرضیت کی ابتدا کا تعیّن کرتے ہیں اس کے الفاظ ہیں "ان کے مال میں سے صدقہ انہیں طہارت اور پاکیزگی بخشیے" (۹ : ۱۰۱)۔ اس آیت میں لفظ زکوٰۃ کی جگہ صدقہ استعمال ہوا۔ اسی طرح وہ آیتِ کریمہ جس سے تمام مفسرینِ کرام نے زکوٰۃ کے آٹھ مصرف متعیّن فرمائے ہیں اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے "بے شک صدقات فقراء کے لیے ہیں" (۹ : ۶۰)۔ یہاں بھی لفظ صدقہ ہی استعمال ہوا ہے۔ یہی صورت احادیث میں نظر آتی ہے۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے ہوئے رسولِ پاکؐ ارشاد فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے ان کے مال میں سے صدقہ مقرر فرمایا ہے کہ وہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے ناداروں پر خرچ کیا جائے" (بخاری، باب الزکوٰۃ)۔ اسی طرح بخاری میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی وہ مشہور حدیث جو زکوٰۃ کے نصاب کے فقہی مسائل کی بنیاد ہے، میں ہر بار لفظ صدقہ استعمال ہوا ہے "پانچ سے کم اونٹوں پر کوئی صدقہ نہیں اور پانچ اوقیہ سے کم چاندی پر کوئی صدقہ نہیں ہے اور پانچ وسق سے کم اناج پر کوئی صدقہ نہیں ہے"۔ لیکن مسند امام احمد بن حنبلؒ میں یہی حدیث لفظ زکوٰۃ کے ساتھ مروی ہے۔ زکوٰۃ کی تحصیل کے سلسلے میں حضورؐ نے جو خطوط نومسلم عرب قبائل کو لکھے ان میں زکوٰۃ کے مفہوم میں ہر بار لفظ

صدقہ استعمال کیا گیا ہے۔ (تاریخ الطبری، ج ص ۱۷۱۸، ۱۷۲۷، ۱۷۳۶)۔

اسی طرح حضرت عمر بن عبد العزیز کا حکم جو مؤطا امام مالکؒ (کتاب الزکوٰۃ) میں منقول ہے، کے الفاظ یہ ہیں: "صدقہ صرف کھیتی، سونے چاندی اور مویشی پر ہے" امام شافعیؒ لکھتے ہیں "زکوٰۃ صدقہ ہے، دونوں کے لیے ایک نام ہے" (کتاب الام للشافعی، ۲: ۶۰)۔ امام ماوردی جیسے نکتہ رس فقیہ کی رائے ہے: "صدقہ زکوٰۃ ہے اور زکوٰۃ صدقہ ہے۔ نام متفرق ہیں لیکن ان کے مُسمّٰی ایک ہیں" (الاحکام السلطانیہ، ص ۱۰۸)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں صدقہ اور زکوٰۃ ہم معنی الفاظ ہیں۔ کیا آپ اس سے اتفاق کریں گے؟

(۹) اگر آپ سوال نمبر آٹھ کا جواب اثبات میں دیں تو کیا ہم فرض انفاق (زکوٰۃ) اور اختیاری انفاق (صدقہ) دونوں کو ایک جگہ اکٹھا نہیں کر سکتے؟ خصوصاً اس وجہ سے کہ اختیاری انفاق پر عمل عموماً نہیں ہو رہا۔ جس سے محروم انسانوں کی تکالیف میں اضافہ ہو رہا ہے۔

(۱۰) کیا یہ صحیح ہے کہ کتاب اللہ، احادیث، افکارِ آئمہ کبار کسی میں کوئی حکم اموالِ زکوٰۃ یا شرحِ زکوٰۃ میں اضافہ کے خلاف موجود نہیں ہے؟ اگر یہ صحیح ہو اور وقت کا تقاضا دونوں میں اضافہ کا ہو تو اضافہ کرنے سے روکنا کس وجہ سے معقول ہے؟

(۱۱) کیا آپ اتفاق فرمائیں گے کہ جو بھی حکم شرح زکوٰۃ کے متعلق ہوگا وہی اموالِ زکوٰۃ کے متعلق ہوگا؟ یعنی اگر شرحِ زکوٰۃ منصوص ہے تو اموالِ زکوٰۃ بھی منصوص ٹھہریں گے اور اگر اموال زکوٰۃ اجتہادی ثابت ہوں تو شرحِ زکوٰۃ بھی اجتہادی سمجھی جائے گی۔

(۱۲) کیا یہ صحیح ہے کہ "چنگی وصول کرنے کا طریقہ عمرؓ بن الخطّاب نے شروع کیا" (ابو یوسف، کتاب الخراج ص ۴۰۴)؟ کیا یہ صحیح ہے کہ امام ابو یوسفؒ تحریر فرماتے ہیں کہ "مسلمانوں سے چنگی کے طور پر جو کچھ لیا جاتے اس کی حیثیت زکوٰۃ کی ہو گی" (ایضاً ص ۴۰۴) کیا آپ کو امام ابو یوسفؒ کی رائے سے اتفاق ہے؟

(۱۳) اگر سوال نمبر ۱۲ کا جواب اثبات میں ہو تو کیا یہ ثابت نہیں ہوتا کہ باوصف اس امر کے کہ حضورؐ نے چنگی پر محصول عائد نہیں فرمایا نہ اموالِ زکوٰۃ میں اس کا ذکر کیا۔ حضرت عمرؓ کا یہ ٹیکس لگانا اور اسے اموالِ زکوٰۃ میں شامل کرنا اس وجہ سے تھا کہ حضرت عمرؓ اموالِ زکوٰۃ کو منصوص نہیں سمجھتے تھے بلکہ اجتہادی خیال فرماتے تھے؟

(۱۴) کیا یہ صحیح ہے کہ حضرت عمرؓ نے مالِ تجارت پر اور گھوڑوں پر زکوٰۃ عائد کی جو حضورؐ نے عائد

نہیں کی تھی (شبلی الفاروق) اور اسی بنا پر مروجہ فقہ ان پر زکوٰۃ کو تسلیم کرتی ہے۔ کیا یہاں بھی حضرت عمرؓ کی نظیر اموالِ زکوٰۃ کو اجتہادی ثابت نہیں کرتی؟

(۱۵) کیا آپ اتفاق فرمائیں گے کہ اموالِ زکوٰۃ میں اضافہ نوعی فرق ہے۔ بخلاف شرحِ زکوٰۃ میں اضافہ کے کہ وہ محض قدری فرق ہے۔ اگر اموالِ زکوٰۃ کا نوعی اضافہ اجتہادی ثابت ہو تو کیا آپ اتفاق فرمائیں گے کہ محض قدری فرق بھی اجتہادی ثابت ہوگا؟

(۱۶) گھوڑوں پر شرحِ زکوٰۃ ایک دینار فی گھوڑا یا قیمت کا پانچ فیصد ہے (ہدایہ، کتاب الزکوٰۃ)۔ حضورؐ نے مویشیوں پر جو شرحِ زکوٰۃ لگائی تھی وہ علی العموم اڑھائی فیصد بنتی ہے۔ کیا آپ اتفاق فرمائیں گے کہ اس معاملہ میں نوعی اور قدری دونوں اضافے ہوتے ہیں؟ اور قدری اضافہ (بشمول نوعی اضافے کے) اگر جائز ہے تو محض قدری اضافہ جائز ماننا پڑے گا؟

(۱۷) کیا یہ صحیح ہے کہ فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے جو فرامین نومسلم عرب قبائل کے سرداروں کو لکھے ان میں صرف دو کی مکمل عبارتیں ہمارے پاس محفوظ ہیں؟ بنو حارث بن کعب کے نام جو فرمان بھیجا گیا وہ صحیح بخاری میں باب الزکوٰۃ کے تحت منقول ہے۔ یمن کے قبائلِ حمیر کے سرداروں کے نام جو فرمان بھیجا گیا وہ سیرت ابن ہشام (ج ۴ ص ۲۵۸-۲۵۹)۔ تاریخ الطبری (ج ۱ ص ۱۷۱۷-۱۷۲۰) اور بعض دیگر کتابوں میں منقول ہے۔ باقی فرامین کا ذکر ملتا ہے لیکن مکمل عبارت نہیں ملتی۔ کیا یہ صحیح ہے کہ ان دو میں بھی مویشیوں کی زکوٰۃ کی تفاصیل میں فرق ہے۔ کیونکہ بنو حارث بن کعب کے نام جو فرمان ہے اس کا متن یوں شروع ہوتا ہے: "چوبیس اونٹوں پر یا ان سے کم میں ہر پانچ پر ایک بکری۔ جب پچیس اونٹ ہو جائیں تو پینتیس اونٹوں تک ایک برس کی اونٹنی۔ جب چھتیس اونٹ ہو جائیں تو پینتالیس تک دو برس کی اونٹنی ..." (بخاری)۔ اس کے برعکس قبائلِ حمیر کے سرداروں کے نام مویشیوں کی زکوٰۃ کا تعین حضورؐ ان الفاظ میں فرماتے ہیں: "چالیس اونٹوں پر اونٹ کا دو سال کا ایک مادہ بچہ۔ تیس اونٹوں پر اونٹ کا دو سال کا ایک نر بچہ ...." (ابن ہشام وغیرہ بحوالہ بالا)

کیا اس تفصیل سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضورؐ موقع کی مناسبت سے شرحِ زکوٰۃ متعین فرماتے تھے اور اسے ناقابلِ ترمیم خیال نہ فرماتے تھے؟

(۱۸) قبائلِ حمیر کے سرداروں کے نام فرمان میں (حوالہ بالا) حضورؐ کا ایک فقرہ بہت اہم ہے۔

حضورؐ تحریر فرماتے ہیں "صدقہ کی یہ شرح وہ ہے جو مومنوں کے لیے خدا نے مقرر کی ہے، جو اس سے زیادہ دے تو اس کے لیے بہتری اسی میں ہے"۔ اس طرح تحریر مبارک میں نہ صرف اضافہ سے منع نہیں فرمایا گیا بلکہ اس کی تحریک فرمائی گئی ہے۔ اگر اس تحریک پر آج عمل متروک ہو جائے تو کیا حکومت کا شرحِ زکوٰۃ میں اضافہ مقصدِ شارع علیہ السلام کو پورا کرے گا یا اس کے خلاف جائے گا؟

(۱۹) مروجہ شرحِ زکوٰۃ کی فرضیت کی تاریخ کے متعلق محدثین کا اختلاف ہے مگر اکثر کی رائے ہے کہ یہ ذیقعدہ ۸ ھ یا محرم ۹ ھ میں فرض ہوئی (فتح الباری ج ۳ ص ۲۰۷)۔ غزوۂ تبوک کا واقعہ رجب ۹ ھ میں پیش آیا۔ اسی غزوہ میں حضرت عمرؓ سے مروی الفاظ میں حضورؐ نے صدقہ یعنی زکوٰۃ دینے کا حکم دیا۔ عربی متن کے الفاظ ہیں "امرنا رسول اللہ ان نتصدق" گویا یہ صدقہ اختیاری نہیں تھا بلکہ حضورؐ نے اس کا حکم دیا تھا۔ اگرچہ قرآن مجید کے مطابق زیادہ سے زیادہ تقاضا العفو کا کیا جا سکتا تھا لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے گھر کی ساری پونجی اٹھا لائے اور حضورؐ نے اسے قبول فرما لیا۔ کیا اگر شرحِ زکوٰۃ سے زائد مانگنا اسلام کے خلاف ہوتا تو حضورؐ متعین شدہ رکھ کر باقی پونجی واپس کر دیتے؟ اگر یہ تعبیر کی جائے کہ غیر معمولی حالات میں ایسا کیا گیا تھا تو کیا غیر معمولی اب نہیں یا آئندہ نہیں ہو سکتے؟

(۲۰) حضرت ابولبابہؓ ان تین صحابیوں میں تھے جو غلطی سے غزوۂ تبوک میں شرکت کرنے سے رہ گئے تھے۔ جب ان کی توبہ قبول ہوتی تو انہوں نے ارادہ کیا کہ ساری دولت "صدقۃ اللہ و رسولہ" قربان کر دیں۔ لیکن رسول اکرمؐ نے ان کی دولت میں سے ایک تہائی سے زیادہ قبول کرنے سے انکار کر دیا (سنن الدارمی ج ۱ ص ۳۹۱)۔ کیا یہ زکوٰۃ کی معین شرح سے زیادہ قبول فرمانے کی مثال نہیں ہے اور کیا ہم حضورؐ کی اس نظیر پر عمل نہیں کر سکتے؟

(۲۱) ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کے پاس قوت و طاقت کے سامان اپنی حاجت سے زائد ہوں۔ اس کو چاہیے کہ فاضل سامان نادار اور حاجتمند کو دے دے۔ ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح مختلف انواعِ مال کا ذکر فرماتے رہے، حتیٰ کہ ہم نے یہ گمان کر لیا کہ ہم میں سے کسی شخص کو اپنے فاضل مال پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں ہے" (محلی، ج ۶ ص ۱۵۷ - ۱۵۸)

کیا یہ حدیث "قل العفو" کی تفسیر نہیں کرتی؟ اگر انفاق فی سبیل اللہ سے افراد غافل ہو گئے ہیں

اور اسلامی حکومت کے استحکام تک کو خطرہ پیدا ہو چکا ہو تو کیا ہم زکوٰۃ کو اس آخری حد یا اس سے کسی کمتر سطح تک نہیں اٹھا سکتے ؟

۲۲- حضرت علیؓ سے منسوب ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں "بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ دولت و ثروت پر اس قدر مال کی ادائیگی کو فرض قرار دیا ہے جو ان کے حاجت مندوں کی کفالت کر سکے۔ (اصل عربی الفاظ ہیں: بقدر ما یکفی فقراٗ ھم) پس اگر لوگ بھوکے اور ننگے اور تکالیف اور شدائد میں مبتلا رہیں تو اس کی وجہ یہی ہو گی کہ اصحابِ دولت نے اپنا فرض ادا نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ قیامت میں ان سے اس عدم ادائیگی فرض پر محاسبہ اور عذاب میں مبتلا کرے" (محلّٰی ابن حزم ج ۶ ص ۱۵۸)۔

(الف) کیا آپ اتفاق فرمائیں گے کہ حضرت علیؓ زکوٰۃ کو کسی شرح کا پابند نہیں بناتے بلکہ ایک نتیجہ کا پابند بناتے ہیں ؟ اور ان کے نزدیک یہ نتیجہ (حاجت مندوں کی کفالت) جس شرح سے بھی حاصل ہو وہی شرح زکوٰۃ ٹھہرے گی ؟

(ب) کیا آپ اتفاق فرمائیں گے کہ حضرت علیؓ مال کی ادائیگی کا فریضہ یعنی زکوٰۃ کی بات کر رہے ہیں۔ کیونکہ عدم ادائیگی کی صورت میں اختیاری انفاق نہیں ہوتا ؟

۲۳- کیا فرض انفاق کی سطح کے سلسلے میں حکومت کی ذمہ داری پر درج ذیل روایت کچھ روشنی ڈالتی ہے:

"حضرت عمر بن الخطّاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس بات کا مجھے آج اندازہ ہوا ہے اگر اس کا پہلے سے اندازہ ہو جاتا تو میں کبھی تاخیر نہ کرتا اور بلاشبہ اربابِ دولت کی فاضل دولت لے کر فقراء مہاجرین میں بانٹ دیتا" (محلّٰی ابنِ حزمؒ، ج ۶ ص ۱۵۸)

کیا اس روایت سے ہمیں قل العفو کی آیت کے مطابق عمل کرنے اور کروانے کی تلقین نہیں ملتی ؟

۲۴- مشہور محدّث ابنِ حزم مندرجہ ذیل رائے کا اظہار فرماتے ہیں:

"اور ہر ایک بستی کے اربابِ دولت کا فرض ہے کہ وہ فقرا اور غرباء کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر مالِ فےَ ان غرباء کی معاشی کفالت کو پورا نہ ہوتا ہو تو سلطان ان اربابِ دولت کو اس کفالت کے لیے مجبور کر سکتا ہے اور ان کی زندگی کے اسباب کے لیے کم از کم یہ انتظام ضروری ہے کہ ان کی ضروری حاجت کے مطابق روٹی مہیا ہو۔ پہننے کے لیے گرمی اور سردی دونوں موسم کے لحاظ سے لباس فراہم ہو اور رہنے کے لیے ایک ایسا مکان ہو جو ان کو بارش، گرمی، دھوپ اور سیلاب جیسے امور سے محفوظ رکھ

سکے" (محلّٰی، ج ۶، ص ۱۵۶)

(الف) کیا آپ امام ابن حزم کی رائے سے اتفاق فرمائیں گے؟

(ب) مالِ فے تو اب ہمیں میسّر نہیں۔ روٹی، کپڑے اور مکان کی کم از کم ضروریات کہاں سے پوری ہونگی۔ اگر ہم شرحِ زکوٰۃ کو اس سطح تک نہ لے جائیں جہاں سے یہ پوری کی جا سکیں؟

۲۵۔ شہاب الدّین احمد الرملی ان تین چیزوں کے علاوہ تین اور چیزوں کو بھی حکومت کی ذمّہ داری قرار دیتے ہیں "نیز ۔ ۔ ۔ ۔ وہ چیزیں شامل ہیں جو اتنی ہی ضروری ہوں، مثلاً طبیب کا معاوضہ، دوا کی قیمت اور معذور کے لیے ملازم"

(نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج، ج ۶ ص ۱۹۴)

(الف) کیا "اتنی ہی ضروری" چیزوں میں تعلیم شامل کی جا سکتی ہے؟

(ب) اگر جواب اثبات میں ہے تو ان چاروں چیزوں کے لیے صرفہ کہاں سے مہیا کیا جا سکتا ہے اگر ہم شرحِ زکوٰۃ اور اموالِ زکوٰۃ کو غیر متبدل قرار دے دیں؟

(ج) کیا یہ بات ذمہ داریاں (روٹی، کپڑا، مکان، طبیب کا معاوضہ، دوا کی قیمت، معذور کے لیے ملازم اور تعلیم) اسلام کی عائد کردہ ذمّہ داریاں نہیں ہیں؟

(د) کیا جس دین نے یہ سات ذمہ داریاں ہم پر عائد کی ہیں، اس نے کوئی اور حل سوائے انفاق کے ہم کو بتایا ہے؟

(ر) کیا ہم اس فرضِ انفاق یعنی زکوٰۃ کو اس سطح پر نہیں لے جا سکتے جس سطح سے یہ سات ذمہ داریاں پوری ہوں؟

۲۶۔ حضورؐ کی ایک حدیث درجِ ذیل ہے۔

"جو مال چھوڑ جائے وہ مال اس کے گھر والوں کے لیے ہے اور جو کسی کو بے سہارا چھوڑ جائے تو اس کی ذمّہ داری میرے سر ہو گی" (ترمذی)

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ "حدیث حسن اور صحیح ہے"

(الف) کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام بیوگان اور تمام یتیموں کی کفالت اسلامی حکومت کی ذمّہ داری ہے؟

(ب) کیا اختیاری انفاق ایسے عظیم مسائل کو حل کر سکتا ہے؟

(ج) کیا اموالِ زکوٰۃ کو وسعت دینے اور شرحِ زکوٰۃ کو بلند تر سطح پر لے جانے کے سوا اسلام کے نزدیک اس کا کوئی اور حل موجود ہے؟

۲۷۔ حضورؐ کی ایک اور حدیث ہے۔

"جس بستی میں کوئی شخص صبح کو اس حال میں اٹھے کہ رات بھر بھوکا رہا ہو تو پھر اللہ تبارک و تعالیٰ پر اس بستی کے بقا و تحفظ کی کوئی ذمّہ داری نہیں رہتی" (مُسند احمد بن حنبل)

ہمارے ملک میں کروڑوں بھوکے و نیم بھوکے سوتے ہیں۔ ابھی تک اللہ پاک ہم پر کرم فرماتے چلے جا رہے ہیں کہ شاید ہم سیدھے ہو جائیں۔ اگر اللہ پاک نے ہمارے تحفظ کی مزید ذمّہ داری قبول نہ فرمائی تو کیا ہمارے طاقتور دشمن ہمیں نگل نہیں جائیں گے؟ کیا جراُت مندانہ فکر و عمل کے سوا بھوک کے مسئلہ کا کوئی حل موجود ہے؟

۲۸۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ ہوئے تو آپ کفالتِ عامہ کی ذمّہ داری محسوس کر کے رونے لگے۔ ان کی بیوی فاطمہ کہتی ہیں کہ میں آپ کے پاس گئی۔ آپ جائے نماز پر تھے اور آنسوؤں سے آپ کی داڑھی تر تھی۔ میں نے پوچھا کہ کیا کوئی نئی بات ہو گئی ہے؟ آپ نے فرمایا میں نے پوری اُمّت محمدّیہ کی ذمّہ داری لے لی ہے۔ لہٰذا میں بھوکے فقیروں، بے سہارا مریضوں، مجاہدین، مظلوم اور ستم رسیدہ افراد، غریب الدیار قیدیوں، بہت بوڑھے افراد اور ان لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو بکثرت اہل و عیال والے ہیں مگر مالدار نہیں ہیں اور مختلف علاقوں میں بسنے والے اس قسم کے دوسرے افراد کے بارے میں متفکّر تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ عنقریب قیامت کے دن اللہ مجھ سے ان کے بارے میں پوچھے گا اور اللہ کے حضور میں میرے مقابلے میں ان لوگوں کے وکیل محمد صلی اللہ علیہ وسلّم ہوں گے۔ مجھے ڈر لگا کہ جرح میں میری بات ثابت نہ ہو سکے گی۔ تو میں اپنی جان پر ترس کھا کر رونے لگا۔ (ابن الاثیر، تاریخ الکامل، ج ۵، ص ۲۴)۔

(الف) کیا ہم اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں حضورؐ کی جرح سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں؟

(ب) کیا یہ امکان تو نہیں کہ شرحِ زکوٰۃ کو جو نا قابلِ ترمیم ہے قابلِ ترمیم قرار دے کر ہم حضورؐ کی جرح کا مزید مضمون پیدا کر رہے ہیں؟

۲۹۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے یہ حکم جاری کیا تھا کہ بیت المال سے مقروض افراد کو ادائے قرض کے لیے مالی امداد دی جائے۔ (ابو عبید۔ کتاب الاموال، ص ۲۵۱)

اگر کفالتِ اجتماعی کے اسلامی تصور میں یہ ضرورت بھی شامل ہے اور اموال و شرح زکوٰۃ بھی ناقابلِ ترمیم ہیں تو ہم کفالتِ اجتماعی کے اتنے وسیع تصور پر کیسے عمل کریں؟

۳۰۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"اگر کسی نہر کے کنارے کوئی خارشتی بکری اس حال میں چھوڑ دی جائے کہ اسے (علاج کے طور پر) تیل کی مالش نہ کی جا سکے تو مجھے اندیشہ ہے کہ قیامت کے دن مجھ سے اس کے بارے میں جواب طلب کیا جائے گا۔" (تنبیہ الملوک، امام غزالی ص ۱۷)

نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اگر ساحلِ فرات پر کوئی اونٹ بے سہارا مر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ مجھ سے اس کے بارے میں جواب طلب کرے گا۔" (محمد ابن سعد۔ الطبقات الکبریٰ، ص ۳۵)

(الف) اگر جانوروں کی صحت و عافیت کی ذمہ داری اس حد تک اسلام قبول کرتا ہے تو انسانوں کی صحت و عافیت کی ذمہ داری کتنی شدید ہو گی۔

(ب) جو دین اتنی عظیم ذمہ داریاں دیتا ہے اس نے اتنا ہی عظیم راستہ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا بنانا ہو گا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اسلام تین گرہ کپڑا دے اور تین گز کی قمیص بنانے کو کہے۔ کیا وہی راستہ وہی آیاتِ قرآن اور احادیثِ رسولؐ نہیں مہیا کرتیں جن کا ذکر اوپر کے سوالوں میں کیا جا چکا ہے؟

۳۱۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں زکوٰۃ کے مقالہ کا مصنف اظہار کرتا ہے کہ حضرت علیؓ کی رائے میں چار ہزار درہم سے زیادہ مالیت کے اموال کسی کے پاس نہیں ہونے چاہییں۔ حدِ ملکیت جو بھی ہو کیا اس حد سے فاضل سامان پر حضرت علیؓ کی رائے کے پیشِ نظر سو فیصد زکوٰۃ عائد نہیں ہو جاتی؟ اور کیا کفالتِ عامہ کے تقاضے ہمیں حدِ ملکیت معین کرنے پر مجبور نہیں کر رہے؟

۳۲۔ کیا یہ صحیح ہے کہ اولیاء اللہ نے کبھی ڈھائی فیصد شرحِ زکوٰۃ کو تسلیم نہیں کیا اور "قل العفو" کی ہدایت کی اور اس معاملے میں اولیاء میں مکمل اتفاق رائے ہے؟ مثلاً حضرت داتا گنج بخشؒ درج ذیل نکات تحریر فرماتے ہیں:۔

(الف) ہر چیز کی زکوٰۃ ہے اور وہ حضورؐ کی دو احادیث بیان فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہارے مرتبہ کی زکوٰۃ فرض کی ہے جیسا کہ اس نے تم پر تمہارے مال کی زکوٰۃ فرض کی ہے۔" اور "بلاشبہ ہر چیز کی زکوٰۃ ہے اور گھر کی زکوٰۃ مہمان خانہ ہے۔" (کشف المحجوب ۔ص ۴۶۴)

(ب) قل العفو کے حق میں اور معیّنہ شرح زکوٰۃ کے خلاف ان کی رائے دو ٹوک ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں "الغرض نعمتِ دنیا کی زکوٰۃ گروہ صوفیہ کے نزدیک اچھی نہیں ہوتی، کیونکہ بخل آدمی کے لیے بہت بُرا ہوتا ہے اور جب پُورا بخل ہو تو کوئی دو سو درہم روک رکھے اور ایک سال برابر ان کو اپنے تصرّف میں نہ لائے اور پانچ درہم ان میں سے دے۔" (ایضاً ص ۴۶۴)۔

معیّن شرح زکوٰۃ کو وہ "پُورا بخل" کہتے ہیں، بے شک عام دنیا دار العفو کے اس بلند درجے تک نہیں پہنچ سکتے لیکن کیا یہ تحریریں اس چیز کا واضح ثبوت نہیں ہیں کہ اوّلاً شرحِ زکوٰۃ کو بڑھانا بخل میں کمی پیدا کریگا اور ثانیاً ان اموال پر بھی زکوٰۃ عائد کی جا سکتی ہے جن کا ذکر فقہ میں مذکور نہیں ہے؟

۳۳۔ زکوٰۃ کے آدابِ باطنی کا ذکر کرتے ہوئے امام غزالی ادائیگی زکوٰۃ کی سطحوں کا ذکر کرتے ہیں۔

"ایک تو وہ جنہوں نے توحید کو سچّی طرح سے ادا کیا اور اپنے عہد کو پُورا کیا اور اپنے سب مال سے دست بردار ہوئے، نہ اشرفی رکھی نہ روپیہ، اور اس بات کے درپے ہی نہ ہوئے کہ ان پر زکوٰۃ واجب ہو یہاں تک کہ بعض اکابر سے کسی نے سوال کیا کہ دو سو درہم میں زکوٰۃ کتنی واجب ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ عوام پر تو شرح کے حکم سے پانچ درہم لیکن ہم لوگوں پر سب کا دے ڈالنا واجب ہے۔ دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن کا درجہ ان کے درجہ سے بلند ہے۔ ان کا قصد یہ ہوتا ہے کہ بقدرِ حاجت خرچ کریں اور یہ لوگ صرف مقدارِ زکوٰۃ پر قناعت نہیں کرتے اور نخعی اور شعبی اور عطا اور مجاہد جیسے علماء کی یہ رائے ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے سوا اور بھی حقوق ہیں۔ چنانچہ شعبی سے پوچھا گیا کہ مال میں زکوٰۃ کے سوا کوئی اور بھی حق ہے؟ تو فرمایا کہ ہاں اور بھی ہے۔ کیا تو نے نہیں سُنا واتی المال علی حبہ ذوالقربیٰ والیتمیٰ اور علماء کا استدلال اس آیت سے بھی ہے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ اور اس سے وَالْفُقَرَاءِ مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ اور کہتے ہیں کہ یہ تینوں آیتیں آیت زکوٰۃ سے منسوب نہیں ہوتیں بلکہ مسلمانوں کا حق جو ایک دوسرے پر ہے اس میں داخل ہیں۔ جب حاجت سے آدمی کی جان پر آبنے تو اس کا دُور کرنا اوروں پر فرض کفایہ ہے، اس لیے کہ مسلمانوں کا تلف درست نہیں۔ ... تیسری قسم ایسے لوگ ہیں کہ صرف واجب کے ادا کر دینے

پر اکتفا کرتے ہیں۔ نہ اس پر بڑھاتے ہیں اور نہ اس سے گھٹاتے ہیں۔ یہ مرتبہ سب مرتبوں سے کم ہے اور عوام سب کے سب اسی پر کفایت کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ مال پر مائل اور بخیل ہوتے ہیں اور آخرت کی محبّت ان کو کم ہوتی ہے۔"

(مذاق العارفین، ترجمہ احیاء علوم الدین جلد اوّل، ص ۲۶۳-۲۶۴)

کیا شرح زکوٰۃ کو تبدیل رکھنا تیسری قسم کی زکوٰۃ سے دوسری قسم کی زکوٰۃ کی طرف عروج کرنا نہیں ہے؟ اور کیا ایسا کرنا اسلام کی اور انسانوں کی بہتری ہے یا ان میں بُرائی کا باعث ہے؟

۳۴۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی رائے میں حضورؐ نے "زکوٰۃ کی مقدار باندازۂ مصارف مقرر فرمائی تھی"۔ (حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۳۸) اور موجودہ صورت میں "بلاشک ضرورتیں غیر محدُود ہیں اور خالص مسلمانوں کی آبادی پر مشتمل ممالک میں زکوٰۃ کے علاوہ زیادہ مال نہیں۔ لہٰذا اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ زکوٰۃ میں، اضافہ و توسیع کی جائے۔ تاکہ وہ ملک کو درپیش ہونے والی تمام ضروریات کے لیے کافی ہو سکے"۔ (ایضاً ص ۲۳۳-۲۳۴)۔

کیا اس سے یہ واضح نہیں ہے کہ مقادیرِ زکوٰۃ میں اس حد تک اضافہ کیا جا سکتا ہے جو مصارفِ معینہ کے لیے ضروری ہو؟

۳۵۔ سیّد قطب شہیدؒ کی رائے اس سلسلہ میں یہ ہے "درحقیقت زکوٰۃ مال و دولت پر عائد کیے جانیوالے ٹیکس کی ادنیٰ ترین شرح ہے اور یہ ان حالات کے لیے ہے جبکہ جماعت کو محاصلِ زکوٰۃ کے بعد مزید فنڈ کی ضرورت نہ پڑے۔ ایسے حالات میں جبکہ زکوٰۃ کی آمدنی کافی نہ ہو۔ اسلام کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں اس نے شریعتِ اسلامی کو نافذ کرنے والے صاحبِ امر کو سرمایہ پر ٹیکس لگانے کے وسیع اختیارات دیئے ہیں۔ وہ سرمایہ میں سے اس قدر طلب کر لینے کا مجاز ہے جس قدر کہ اصلاحِ مال کے لیے ضروری ہو"۔ (اسلام میں عدلِ اجتماعی، ص ۲۵۵)۔

کیا یہ واضح طور پر شرحِ زکوٰۃ کو بڑھانے کی اجازت کا اعتراف نہیں ہے؟

۳۶۔ شرحِ زکوٰۃ کے متعلق ایک سوال کے جواب میں مولانا ابُوالکلام آزاد نے شیخ محمود احمد ناظمِ تعلیماتِ حکومت آزاد کشمیر کو ۲۶ جولائی ۱۹۴۵ء کو جو خط تحریر کیا اس کا متعلقہ حصہ درجِ ذیل ہے:-

"اصل شرعی اس بارے میں آیتِ زکوٰۃ ہے۔ اس نے کوئی خاص رقم معیّن نہیں کی۔ اس پر زور دیا کہ آمدنی کا ایک حصہ اسٹیٹ کو مستحقوں کی اعانت کے لیے دینا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے مختلف موقعوں پر مختلف مقدار کے حصص معیّن فرمائے۔ صحابہ نے بعہد خلافتِ اوّل اس مسئلہ پر غور کیا اور موجودہ شرح معین کی۔ یہ شرح مخصوص نہیں ہے اجتہادی ہے اور اہلِ حل و عقد کا فرض ہے کہ ہر زمانہ کی اقتصادی حالت اور سوسائٹی کے احتیاجات کے مطابق رقم معیّن کریں۔"

کیا یہ تحریر واضح طور پر تبدل شرح زکوٰۃ کا اعتراف نہیں کرتی؟ (اصل تحریر مولانا آزاد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی شیخ صاحب موصوف کے پاس دیکھی جاسکتی ہے)۔

۳۷۔ کیا آپ اتفاق فرمائیں گے کہ اسلامی قانون کے مطابق اگر کسی بستی میں کوئی شخص بھوکا مرجائے تو تمام بستی اس فرد کی قاتل قرار پاتی ہے؟

"ہر بستی کے لوگ ایسے فرد کے بارے میں جوابدہ ہیں جو وہاں بھوک کی وجہ سے موت کا شکار ہوجائے یہ جوابدہی فوجداری قانون کے تحت آتی ہے اور بستی والوں پر اس طرح مرجانے والے فرد کی دیت دینی واجب ہوتی ہے۔"

(امام احمد بن حنبل، منقول از "موجودہ اقتصادی بحران اور اسلامی حکمتِ معیشت" شائع کردہ: شعبۂ نشر و اشاعت جماعت اسلامی، ص ۲۱۳)۔

کیا یہ جوابدہی مروجہ شرح زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد بھی باقی رہتی ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو کیا ثابت نہیں ہوتا کہ کفالت عامہ کی حد تک ہم انفاق کے پابند ہیں؟ اور کیا جب تک کفالتِ عامہ کا حق ادا نہیں ہوتا زکوٰۃ کی ادائیگی کی تکمیل ہوسکتی ہے؟

۳۸۔ اسلامی قانون کی ایک اور شق اس نقطۂ نظر کی تصدیق کرتی معلوم ہوتی ہے "بھوکے یا پیاسے کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ اگر اسے بھوک یا پیاس کے سبب اپنی جان جانے کا اندیشہ ہو تو وہ کھانا یا پانی رکھنے والے سے جنگ کرسکتا ہے۔ اور اگر اسے قتل کردے تو اس پر نہ دیت لازم ہے اور نہ اُخروی عذاب ہوگا" (امام احمد بن حنبلؒ بحوالہ بالا)۔

کیا قانون کی یہ شق کفالتِ عامہ کی فرضیت واضح نہیں کرتی؟ کیا اس شق میں مروجہ شرح پر زکوٰۃ دینے کے بعد کوئی نرمی وارد ہوتی ہے؟ اگر نہیں تو کیا شرح زکوٰۃ سے فاضل ادائیگیوں کے ہم پابند نہیں ہیں؟

اگر ہیں تو ہم کیوں شرح زکوٰۃ کے غیر تبدیل ہونے پر اصرار کرتے ہیں؟

۳۹۔ تبدیل شرح زکوٰۃ کے خلاف یہ دلیل عام طور سے دی جاتی ہے کہ زکوٰۃ محض ٹیکس نہیں بلکہ عبادت ہے، کیا مومن کی زندگی کا کوئی عمل عبادت سے خارج کیا جا سکتا ہے؟ کیا روزی کمانا عبادت نہیں؟ کیا سونا اور جاگنا، اٹھنا اور بیٹھنا عبادت نہیں؟ کیا حکومت کے واجبات یا ٹیکس دینا عبادت نہیں؟ کیا سفر کرنا عبادت نہیں۔ اب سفر کے احوال مثلاً جادہ و مرکب و منزل۔ زمان و مکان کے تابع ہونے کی وجہ سے اپنی کیفیت بدلتے رہتے ہیں۔ کیا سفر کے عبادت ہونے کی وجہ سے یہ ناگزیر تبدیلیاں ناجائز ٹھہریں گی؟

۴۰۔ ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اگر شرح و اموالِ زکوٰۃ کو غیر تبدیل مان لیں تو پھر کل کو نمازوں اور رکعتوں کی تعداد بھی تبدیل ماننا پڑے گی۔ اس اندیشہ کا اس وجہ سے کوئی جواز نہیں ہے کہ شرح و اموالِ زکوٰۃ حالات و ضروریات کے متبدل ہونے کی وجہ سے تابع زمان و مکان ہیں۔ لیکن جذبہ و اظہار عبودیت جو نمازوں اور ان کی معین رکعتوں میں ادا ہوتا ہے، زمان و مکان کے تابع نہیں ہے۔ لہٰذا مُرورِ ایام ان پہ اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ آپ کی اس میں کیا رائے ہے؟

جزوِ دوم

(اگر آپ کا موقف یہ ہو کہ زکوٰۃ اپنی تمام جزئیات اور تفاصیل کے ساتھ اسی شکل و صورت میں رہنی چاہیے جو فقہ میں مذکور ہیں اور مصارف دیگر ٹیکسوں سے پورے کرنے چاہییں تو براہِ کرم مندرجہ ذیل مشکلات کا حل بھی تجویز فرمائیں)۔

۴۱ (الف) کیا حضورؐ نے یا حضورؐ کے خلفائے راشدین نے یا ائمہ دین نے دیگر کوئی ٹیکس لگانے کی اجازت دی ہے؟

(ب) کیا غنائم، فے، جزیہ اور خراج کے علاوہ اسلام کے مالیاتی نظام میں تمام محاصل زکوٰۃ نہیں کہلاتے؟

(ج) کیا چونگی کے محصول، مالِ تجارت کی زکوٰۃ، گھوڑوں کی زکوٰۃ، زمینوں کے عُشر اور نصف عشر، معادن اور خزائن کے خمس، سمندری پیداوار کے خُمس، تمام محاصلِ زکوٰۃ نہیں ہیں؟

(د) اگر اسلام کا مالیاتی نظام (غنائم، فے، جزیہ اور خراج کے علاوہ جو ہمیں آج کل میسّر نہیں ہیں)

تمام محاصل کو زکوٰۃ کہنے پر اصرار کرتا ہو تو جو نئے ٹیکس لگائے جائیں انہیں اسلام کے مالیاتی مزاج اور روایت کے مطابق زکوٰۃ کیوں نہ کہا جائے ؟

(د) کیا ائمہ دین اور فقہاء کا تمام ٹیکسوں کو زکوٰۃ کہنا اس عظیم مصلحت کے باعث تھا کہ وہ ٹیکسوں میں دین و دنیا کی دوئی پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ یہ دوئی اسلامی مزاج کے ساتھ بنیادی طور پر متناقض ہے ؟

(س) اگر یہ کہنا صحیح ہو کہ جو ٹیکس لگے گا وہ زکوٰۃ کہلائے گا تو پھر یہ کہنا کہ متعین شرح زکوٰۃ کو نہ بدلا جائے اور ضروریات دیگر ٹیکسوں سے پوری کی جائیں، اسلام کے مالیاتی مزاج اور روایت کے مخالف تجویز نہیں ہے ؟

۴۲۔ کیا یہ صحیح ہے کہ متداولی مالیاتی نظام نے محاصل زکوٰۃ کے دو بنیادی نکات ابھی تک نہیں اپنائے۔ ایک غیر مستقل رقموں اور سونے چاندی کی زکوٰۃ اور دوسرے سرمایہ پر ٹیکس جس کا مظہر فقہی فکر میں جانوروں پر زکوٰۃ اور مالِ تجارت پر زکوٰۃ ہیں، اگر ہمارا مالیاتی نظام ان دو اصولی محاصل کو اپنائے اور مالیہ اور معادن کی اکسائز ڈیوٹی کو عشر اور خمس سے کم نہ رہنے دے اور مصارف کی مد میں کفالتِ عامہ کی ذمہ داری اٹھالے تو کیا ہمارا مالیاتی نظام زکوٰۃ کا مالیاتی نظام نہیں بن جاتا ؟

۴۳۔ اگر اصرار کیا جائے کہ تفاصیل اور مقادیرِ زکوٰۃ غیر متبدل ہیں تو ہم اپنا نصاب کیسے مقرر کریں گے ؟ نصاب ساڑھے سات تولے سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں سکے چاندی کے تھے اور درہم کہلاتے تھے یا سونے کے تھے اور دینار کہلاتے تھے اور دس درہم کا ایک دینار ہوتا تھا۔ (حجۃ اللہ البالغہ، ۲: ۳۳)، اس طرح وزن کے اعتبار سے ساڑھے سات تولے سونا، ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر قیمت رکھتا تھا۔ اب ہمارے پاس نہ چاندی کا سکہ ہے اور نہ سونے کا۔ کاغذی سکہ ہے۔ دوسری دقت یہ ہے کہ ساڑھے باون تولہ چاندی قریباً تین سو روپے میں آتی ہے اور ساڑھے سات تولے سونا قریباً چودہ سو روپے میں آتا ہے۔ اب آپ وضاحت فرمائیں کہ:

(الف) کیا کاغذی سکہ پر زکوٰۃ عائد ہوگی یا نہیں ؟

(ب) اگر (الف) کا جواب اثبات میں ہے تو کیا ہم حضورؐ کے معین کردہ اموالِ زکوٰۃ میں اضافہ نہیں کر رہے ہوں گے ؟

(ج) ہمارا نصاب کیا ہو گا، چاندی کے پیمانے والا (تین سو روپے) یا سونے کے پیمانے والا (چودہ سو روپے)۔

(د) اگر مقادیر و تفاصیل زکوٰۃ کو غیر متبدل مانا جائے تو کیا منطقی طور پر (ج) کا جواب تین سو روپے اور چودہ سو روپے نہیں آتا؟ جو ظاہر ہے کہ بے معنی جواب ہو گا۔

(ر) اگر دونوں رقموں میں سے کسی ایک کو منتخب کریں تو کیا ہم حضورؐ کی مقرر کردہ مقادیر میں ترک و اختیار نہیں کر رہے ہوں گے؟

(س) کیا ترک و اختیار کرنا اور کسی چیز کا متبدل ہونا ایک ہی مفہوم نہیں رکھتا؟

۴۴۔ جانوروں کی زکوٰۃ جو بدوی معاشرہ میں بڑی اہم دولت تھی اور ہمارے موجودہ معاشرہ میں خاصی غیر اہم دولت ہے۔ کیا ہم حکومت کی سطح پر اسے عاید کریں گے یا نہیں؟

(الف) اگر جواب اثبات میں ہے اور اگر ماہرین مالیات بتائیں کہ اس زکوٰۃ کے جمع کرنے کا خرچ اس کی وصولی سے زیادہ ہو گا تو کیا آپ اپنا جواب بدلنے کے لیے تیار ہوں گے۔

(ب) کیا آپ امام ابو عبید کی رائے سے اتفاق کریں گے کہ عاملینِ زکوٰۃ کا خرچ کسی مد کے محاصل کی ایک چوتھائی سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے؟ (کتاب الاموال جلد ۲ ص ۳۵۴)

(ج) اگر شق (ب) کا جواب اثبات میں ہو اور زکوٰۃ کی اس مد (جانوروں کا خرچ آمدنی سے زیادہ ہو تو کیا اسے ترک کرنا (کم از کم حکومت کی سطح پر) اسے جاری کرنے سے بہتر نہیں ہو گا؟

(د) کیا اگر ہم اسے ترک کریں (حکومت کی سطح پر) تو کیا اس سطح کی حد تک اموالِ زکوٰۃ میں تبدیلی نہیں لا رہے ہوں گے؟

۴۵۔ کیا آپ اس سے اتفاق فرمائیں گے کہ تفاصل و مقادیر زکوٰۃ معین کرتے ہوئے آپ اجتہاد کرنے پر مجبور ہیں؟ بالخصوص مثلاً مندرجہ ذیل صورتوں میں:-

(الف) فرض دی گئی رقم پر زکوٰۃ کیونکہ اس کی تفاصیل میں اُئمہ میں اختلاف ہے۔

(ب) مکان کے باہر مثلاً باغ میں دفن دولت پر زکوٰۃ بوجہ اختلافِ اُئمہ۔

(ج) گھوڑوں پر زکوٰۃ بوجہ اختلافِ اُئمہ۔

(د) بیس مثقال سے اوپر چار سے کم مثقال سونے پر زکوٰۃ اور دو سو درہم سے اوپر چالیس سے کم درہم

چاندی پر زکوٰۃ بوجہ اختلاف آئمہ۔

(د) سونے اور چاندی پر زکوٰۃ بوجہ اختلاف آئمہ۔

(س) نصف نصاب چاندی اور نصف نصاب سونے پر زکوٰۃ بوجہ اختلاف آئمہ،

۴۶۔ (الف) ۔کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ آئمہ کرام تفاصیل زکوٰۃ پر فکر فرماتے تھے اور اپنے اپنے ماحول کے مطابق فیصلے کرتے تھے ۔خواہ وہ ایک دوسرے کے متضاد ہوں ؟

(ب) نیز یہ کہ جو چیز ان کے لیے خدمتِ اسلام تھی وہ امتِ محمدیہؐ کے لیے آج کیوں خدمتِ اسلام نہیں ٹھہرے گی ؟

۴۷ ۔فقہ کی مستند کتاب ہدایہ کے مطابق اگر لونڈی تجارت کی غرض سے خریدی جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو گی ۔

(الف) کیا آپ اس شق کو اپنے ملک کے زکوٰۃ کے قانون میں شامل کریں گے ؟

(ب) اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا اس کے بعد بردہ فروشی (جو موجودہ قانون میں ناجائز ہے اور اسلام کو ناپسند ہے) جائز نہیں ہو جائے گی ؟ اور کیا ایسا قانون بنانے کے بعد اسلام کے دشمن اسلام پر نظامِ غلامی قائم کرنے کا اتہام نہیں لگائیں گے ؟

(ج) اگر (الف) کا جواب نفی میں ہے تو آپ کو اس شق میں ترمیم کرنے کا کیسے اختیار ہوا جبکہ آپ کا بنیادی موقف یہ ہے کہ تفاصیلِ زکوٰۃ ناقابلِ ترمیم ہیں ؟

۴۸ (الف) کیا ہم اپنے زکوٰۃ کے قانون میں یہ شق لکھیں گے یا نہیں کہ بنو تغلب پر زکوٰۃ کی شرح باقی لوگوں کی زکوٰۃ سے دوگنی ہو گی ؟ کیونکہ حضرت عمرؓ نے یہ طے کیا تھا اور فقہ کی سب کتابوں میں یہی لکھا ہوا ہے ؟

(ب) اگر جواب اثبات میں ہے تو ایسی شق لکھنے کا کیا فائدہ ہے جس کا عملاً کوئی اطلاق نہ ہو ؟ کیونکہ پاکستان میں تو بنو تغلب نہیں رہتے ۔

(ج) اگر (الف) کا جواب نفی میں ہو تو زکوٰۃ کی ایک تفصیل کو قلمزد کرنے اور زکوٰۃ کی تفصیل میں ترمیم کرنے کا حق آپ کو کیسے حاصل ہوا ؟

۴۹ ۔مالِ تجارت میں نصاب مقرر کرنے میں وہی دقت ہے جس کا حل کاغذی سکّے کے نصاب کے

متعلق سوال نمبر ۳۴ (ج) میں پوچھا گیا ہے۔ براہِ کرم اس کی وضاحت فرمائیں کیونکہ امام محمد کی یہ رائے ہے کہ دیکھنا چاہیے کہ غرباء کو کس میں فائدہ ہے لیکن مبسوط میں امام محمدؒ یہ رائے دیتے ہیں کہ تاجر خود فیصلہ کرے کہ وہ کونسا نصاب پسند کرے گا (ہدایہ)۔ ان دو متضاد آراء میں سے آپ کونسی رائے کا انتخاب کرینگے اور ترکِ اختیار کا حق آپ کو کیسے حاصل ہوگا۔

۵۰۔ مالِ تجارت پر زکوٰۃ کی شرح مسلمانوں کے لیے ۲½ فیصد ذمیوں سے پانچ فیصد اور غیر ملکیوں سے دس فیصد ہے (ہدایہ کتاب الزکوٰۃ)۔

(الف) ٹیکس میں گروہی اختلافِ شرح بنیادی انسانی حقوق جو تمام ممالک بشمول پاکستان مان چکے ہیں کے خلاف ہے کیا ہم شرحِ زکوٰۃ میں یہ امتیاز برقرار رکھ سکتے ہیں؟

(ب) اگر ہم یہ امتیاز باقی رکھیں تو کیا دیگر ممالک مسلمانوں کے خلاف امتیازی شرح ٹیکس مقرر کرنے میں حق بجانب نہیں ہوں گے؟

(ج) اگر ہم ذمیوں اور غیر ملکیوں کی شرح کو اصولِ مساوات کے تحت برابر کر دیں تو کیا ہم شرح زکوٰۃ کو متبدل قرار نہیں دے رہے ہوں گے؟

۵۱۔ درآمدی محاصل زکوٰۃ میں شامل ہیں اور ان کی شرح وہی ہے جو کہ سوال نمبر ۵۰ میں مذکور ہے۔ علاوہ اس مسئلہ کے جو سوال میں بیان کیا گیا ہے۔ درآمدی محاصل کی شرحیں مختلف معاشی مصلحتوں کے پیشِ نظر بہت مختلف رکھی جاتی ہیں اور ایسا کرنا ناگزیر ہے۔ مثلاً سامانِ تعیّش پر محصول بہت گراں ہوتا ہے۔ شدید ضرورت کی چیزوں پر کم رکھا جاتا ہے۔ جن چیزوں میں ملکی صنعت کی حوصلہ افزائی کرنا مقصود ہو اس کی شرح محصول بڑھا دی جاتی ہے۔ جب صنعت مسابقت کے قابل ہو جاتے تو محصول کی شرح کم کر دی جاتی ہے اور اس قسم کی بیسیوں ناگزیر مصلحتیں ہیں جن کو سامنے رکھ کر محصول کی شرح معیّن کی جاتی ہے

(الف) کیا ہم ان سب مصلحتوں سے صرفِ نظر کر کے درآمدی محاصل کو سب چیزوں کے لیے کسی ایک سطح پر مقرر کر سکتے ہیں۔

(ب) مثال کے طور پر شراب پر ۸۰۰ فیصد محصول درآمد ہے فقہی نقطۂ نظر کے مطابق زیادہ سے زیادہ ۱۰ فیصد محصول لیا جا سکتا ہے، اب اگر ۱۰۰ روپے کی شراب پر ۸۰۰ روپیہ محصول لینے کے بجائے ہم دس روپے محصول لینے لگ جائیں تو شراب کی درآمد دس گنا بڑھ جائے گی اور اس کی کھپت بھی اس محصول کو

فقہی سطح پر لانا اسلام کی حرمتِ شراب کے تصوّر کے مترادف تو نہیں ہو جائے گا۔ یہاں یہ وضاحت شاید ضروری ہے کہ شراب پر محصول زکوٰۃ میں شامل ہے۔ حضرت عمرؓ نے اسے صدقۃ الخمر کہا ہے۔ یہی ترکیب امام ابوعبید کی کتاب الاموال میں بیان ہوئی (دیکھیے جلد دوم ص ۳۹)۔ ہدایہ میں اسے کتاب الزکوٰۃ میں شامل کیا گیا ہے)۔

(ج) ایک اور مثال لیجیے۔ کاروں پر کم سے کم درآمدی محصول ۱۰۰ فیصد ہے۔ اب اگر اس کو کم کر کے ۲½ فیصد کر دیا جائے تو سارا زرِ مبادلہ کاروں میں کھپ جائے گا اور شدید ترین ملکی ضرورتوں مثلاً اناج اور دفاع کے لیے کچھ نہیں بچے گا۔ اب اگر شرح زکوٰۃ کو متبدل نہ مانا جائے تو ہمارے اقتصادی ڈھانچہ کی بنیادیں بھی ہل جائیں گی۔ لوگ بھوکے مرنے شروع ہوں گے اور ہمارے دشمن ہم پر چڑھ دوڑیں گے۔ کیا آپ اس کے باوصف شرح زکوٰۃ کو غیر متبدل قرار دینے پر اصرار کریں گے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو متعلقہ اقتصادی اور دفاعی مسائل کا حل آپ کے پاس کیا ہے؟

(د) علاوہ ازیں ایک مالیاتی مسئلہ بھی ہے۔ اگر درآمدی محاصل اتنے گھٹا دیئے جائیں تو حکومت کے خزانے کی کمی کیسے دُور کی جائے گی؟ اور اس کے مصارف کیسے پُورے کیے جائیں گے۔

(ہ) اناج مثلاً گندم اور چاول کی درآمد پر کوئی محصول نہیں ہے۔ اب اگر اس پر ۲½ فیصد محصول عائد کر دیا جائے تو نہ صرف اجناس مہنگی ہوں گی بلکہ دیگر ضروریاتِ زندگی پر بھی اس کا بُرا اثر پڑے گا۔ کیا زکوٰۃ کی شرح کا غیر متبدل تصور غریبوں کی زندگی کو اس محصُول کے پیشِ نظر آسان بنائے گا یا ان کی دقتوں میں اضافہ کا باعث ہوگا؟ اور کیا یہ زکوٰۃ کا مقصود ہو سکتا ہے؟

(یہ صرف تین مثالیں دی گئی ہیں ورنہ درآمد کی جانے والی کوئی سی شَے بھی ایسی نہیں جس پر ۲½ فیصد محصول درآمد معیّن کرنا تمام دقتوں کے لیے ناقابلِ عمل ہے)

(س) کیا فقہ کا یہ مُسلّمہ اصول نہیں ہے کہ جو چیز قابلِ عمل نہ ہو وہ اسلام نہیں ہوتی؟

(ش) کیا غیر متبدل شرح و اموالِ زکوٰۃ کے تصور کی وجہ سے زکوٰۃ کا قانون بنانا ناممکن نہیں ہو جاتا؟ کیا زکوٰۃ کے قانون کو نافذ العمل کرنے کے لیے شرح و اموالِ زکوٰۃ کو متبدل بنانا ناگزیر نہیں ہے؟

(ص) کیا ہم قومی مالیاتی سطح پر اس بات پر مجبور نہیں ہیں کہ یا تارکِ زکوٰۃ بنیں جو ہم اب تک ہیں یا تارکِ شرحِ زکوٰۃ بنیں جس پر ہم اب تک تیار نہیں ہوتے؟

اگر زکوٰۃ اور شرحِ زکوٰۃ میں سے صرف ایک چیز رکھی جا سکے تو ہمیں کس چیز کا انتخاب کرنا چاہیے۔

۵۲۔ اموالِ زکوٰۃ کو غیر متبدل قرار دینے میں بھی دقتیں اس قدر ناقابلِ عبور ہیں کہ کوئی زکوٰۃ کا قانون نہیں بن سکتا جب تک یہ غیر متبدل قرار نہ دی جائیں، مثلاً:

(الف) سونے چاندی پر زکوٰۃ ہے لیکن ہیروں، پلاٹینیم، محلوں، قالینوں، مصوّروں کی قیمتی تصویروں اور دیگر سامانِ ثروت پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اب اگر ۳۰۰ روپے کے چاندی کے زیور پر ایک غریب عورت سے زکوٰۃ لی جائے جو خود مدد کی مستحق ہو لیکن تین لاکھ کے ہیروں کے زیور پر زکوٰۃ نہ لی جائے تو یہ انصاف سے اس قدر بعید ہے کہ آج کی کوئی حکومت ایسا قانون بنانے سے قاصر ہو گی آپ اس ناانصافی کو کیسے دُور فرمائیں گے؟

(ب) اب اگر ایک بیوہ کے دو مکان ہوں جن میں سے ایک میں وہ خود رہتی ہو اور دوسرا کرائے پر دے رکھا ہو جس کی آمدنی پر وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہو تو اس پر تو زکوٰۃ ہے لیکن اگر کسی شخص کے دس محلّات دس شہروں میں ہوں جن میں سے ایک میں اس کی رہائشی ضروریات سے دس گُنا مکانیت ہو لیکن اسے کسی محل کو کرایہ پر دینے کی ضرورت نہ ہو تو اس پر کوئی زکوٰۃ نہیں لگے گی کیا یہ چیز اسلام کے اصولِ مساوات کے مطابق ہے؟ اور کیا ایسا قانون بنانا ممکن ہے؟

(ج) یہی معاملہ قالینوں تصویروں اور دیگر سامانِ ثروت کا ہے۔ جب تک وہ اموالِ زکوٰۃ میں شامل نہ ہوں، ۳۰۰ روپے کے چاندی کے زیور پر زکوٰۃ عائد کرنا ناقابلِ عمل ہے کیا آپ اس سے اتفاق فرمائیں گے؟

(د) مالِ تجارت پر زکوٰۃ ہے لیکن کارخانوں پر نہیں۔ اگر سرمایہ پر ٹیکس زکوٰۃ ہے تو مالِ تجارت بھی سرمایہ ہے اور کارخانے بھی سرمایہ ہیں۔ کیا محض اس وجہ سے ہم کارخانوں پر ٹیکس عاید نہیں کر سکتے کہ جس زمانے میں فقہ لکھی جا رہی تھی اس زمانے میں اتنے بڑے کارخانے نہیں ہُوا کرتے تھے؟ دس دس کروڑ کے دسیوں کارخانے ملک میں موجود ہیں اور اربوں کا فولاد کا کارخانہ لگ رہا ہے۔ اگر ہم ان پر زکوٰۃ عاید نہیں کریں گے تو ہم افلاس کا علاج کیسے کریں گے۔

۵۳۔ غیر مستعمل روپیہ اور سرمایہ دونوں پر شرحِ زکوٰۃ ۲½ فیصد ہے جو مالیاتی اصولوں اور فلاحِ مملکت کے خلاف ہے۔ سرمایہ پر شرحِ زکوٰۃ چیزوں کو مہنگا کرتی ہے اور اسے شاید گھٹانا پڑے اس کے خلاف مستعمل روپیہ پر شرحِ زکوٰۃ سے پیداآور مقاصد استعمال کیے جانے پر مجبور کرتی ہے جس سے ملک میں

روزگار بڑھتا ہے لہٰذا اس شرح کو بڑھانا پڑے گا، بہرصورت دونوں شرحیں ایک نہیں رکھی جا سکتیں کیونکہ غیر مستعمل روپیہ کو سرمایہ بنانے کی تحریک مر جائے گی۔ کیا آپ اس سے اتفاق فرما سکتے ہیں ؟ یا کم از کم اس نکتے کو محلِ نظر خیال فرمائیں گے ؟

۵۴۔ یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ افلاس زدہ عوام اسلام کی اخوّت و مساوات کا انتظار کرتے کرتے تھکے جا رہے ہیں۔ وہ اب بھی اسلام کے دروازے پر کھڑے اپنی بھوک اور ننگ کا مداوا ڈھونڈ رہے ہیں، اگرچہ ان میں سے کچھ تھک ہار کر سوشلزم کے دروازے پر جا رہے ہیں جہاں سے آواز آ رہی ہے آؤ تمہاری بھوک اور ننگ کا علاج میرے پاس ہے۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہم اسلام کے دروازے سے ان کو بتائیں کہ ہمارے پاس بھوک اور ننگ کا ایسا علاج ہے جو ان کی شخصی آزادی اور عزتِ نفس کو ضعف پہنچائے بغیر "رزقِ کریم" کا ضامن ہے۔ اگر ہم صحتِ فکر سے انہیں جواب نہ دیں تو وہ جو بھٹک گئے ہیں یا وہ جو اسلام کے دروازے پر کھڑے ہیں، سوشلزم کی چوکھٹ پر جھک جائیں گے اور ان سب کا گناہ ان لوگوں پر ہوگا جو اسلام کو ایسی شکل میں پیش کرنے پر اصرار کرتے ہیں جس پر کبھی عمل نہ کیا جا سکے۔

آج پوری قوم عملاً دوراہے پر کھڑی ہے، کیا یہ ضروری ہے کہ ہم انہیں حضورؐ اکرم کے راستے سے ہٹا کر سوشلزم کے سنگلاخ رہگزر پر چلنے کو مجبور کریں ؟

"جہاں آج سے دس بیس سال قبل بازاروں کے چوراہوں اور موڑوں پر مذہبی مناظرے ہوا کرتے تھے اور تعلیم یافتہ مسلمان عصرِ حاضر کے متعلق کتابیں پڑھ پڑھ کر اپنا سر کھپاتے تھے وہاں آج کا مسلمان نوجوان ان علمی مشکلات سے بالکل بے خبر اور بے پروا ہے جو زندگی کے صحیح راستہ کی حیثیت سے مذہب کے سامنے آ رہی ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح سے آزاد خیال مسلمانوں نے ان اعتراضات کا قریباً قریباً مکمل جواب دیا جو عیسائیوں نے اسلام پر کیے تھے مگر آج کا ترقی پسند مسلمان انہی کو کافی سمجھے ہوئے ہے اور اب کوئی ایسا مسلمان پیدا نہیں ہوتا جو جواب دینا تو الگ نئے اعتراضات کا ذکر بھی کرے جو دورِ جدید کے فلسفی، مورّخ، ماہرِ نفسیات اور ماہرِ اجتماعیات نے اسلام پر بلکہ سارے مذہب پر وارد کر رکھے ہیں"

——— کینٹول سمتھ د ماڈرن اسلام ان انڈیا صفحہ ۱۷۳